الوفیات

مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

سعید احمد اکبرآبادی

مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری کا حادثۂ وفات ۱۷ر اکتوبر کو پیش آچکا تھا لیکن چونکہ ۱۶ر اکتوبر کو ہی سرینگر پہونچ گیا تھا اور وہاں نہ کوئی اخبار نظر سے گذرا اور نہ ریڈیو سنا اس لئے اس حادثہ سے بالکل لاعلم تھا ۲۰ر کی صبح کو مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری کے ساتھ ناشتہ کی میز پر بیٹھا ہوا مولانا بنوری کا تذکرہ صیغۂ حال سے کر رہا تھا کہ مولانا بجنوری نے مجھے ٹوکا اور بولے "مگر مولانا اب ہیں کہاں" اچانک یہ فقرہ سنکر دل کی حالت غیر ہوگئی۔ اور میرے دریافت کرنے پر جب انھوں مولانا بنوری کے حادثۂ ارتحال کا واقعہ سنایا تو جی دھک سے ہو گیا اور سکتہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ انا للہ انا الیہ راجعون۔ ا

گذشتہ سال مارچ میں جب ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ تو اگرچہ بہت کمزور نظر آرہے تھے۔ اور خود بھی اپنے عوارض و اسقام کا ذکر کرکے ضعف و اضمحلال کے سخت شاکی تھے۔ لیکن اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اُن سے بس یہ آخری ملاقات ہے اور اب وہ دنیا میں صرف ڈیڑھ برس کے مہمان ہیں۔ لیکن موت جس درجہ یقینی ہے اوس کا وقت اسی درجہ غیر یقینی ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ کب اوس کا پیمانۂ عمر لبریز ہو جائے گا۔ اور اوس کا حال ماضی کی ایک داستان پارینہ بن جائے گا۔ زندگی ہے کیا؟ آخر ایک ساز ہی تو ہے کہ ضربت مضراب نفس سے نغمہ ریز رہتا ہے

جہاں یہ مضراب ٹوٹا یہ ساز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا :-

نفس کی آمد و شد ہے نماز اہل حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو! قضا سمجھو (ذوق)

مرحوم ۶ ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء کو بروز جمعرات پشاور میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد ماجد جو خود بلند پایہ عالم تھے۔ اُن کا نام سید زکریا تھا۔ ان کے جد امجد سرحد کے ایک مشہور بزرگ میر احمد شاہ بنوری تھے۔ مولانا محمد یوسف نے ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب، مقامی اور کچھ کابل کے جید علما سے حاصل کی ۱۳۴۵ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ دو برس دورۂ حدیث کی موقوف علیہ کتابوں کا درس لینے کے بعد حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ دو برس بعد دورۂ حدیث سے فارغ ہوکر پنجاب یونیورسٹی لاہور کے امتحان مولوی فاضل میں بیٹھے اور درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک جماعت کے ساتھ ڈابھیل ضلع سورت میں منتقل ہوئے تو مولانا بنوری وہاں آگئے۔ اور کچھ درس کا سلسلہ شروع کیا۔ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور اس کثرت سے سوال کرتے تھے کہ مجھے یاد پڑتا ہے بعض اوقات حضرت شاہ صاحب اکتا جاتے اور حسب عادت بہ طور مزاح ایک دو جملے طنزیہ فرما دیتے تھے۔ اسی زمانہ میں حضرت شاہ صاحب کے ایک تلمیذ رشید مولانا محمد میاں سملکی نے جو جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) کے ایک نہایت متمول اور تجارت پیشہ گجراتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈابھیل میں مجلس علمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کا بنیادی مقصد حضرت الاستاذ کے علوم وفنون کی اشاعت تھا۔ اس ادارہ نے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت الاستاذ کی درس بخاری کی تقریریں جن کو الشیخ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ثم مدنی نے عربی میں قلمبند اور منضبط و مدون کئی جلدوں میں کیا تھا اور نصب الرایہ جو تخریج زیلعی کے نام سے مشہور ہے، ان دونوں کو

مصر میں چھپوانے کا پروگرام بنا لیا۔ اس کام کے لئے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری صاحب انوار الباری شرح صحیح بخاری کا انتخاب عمل میں آیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کام کے لئے اس سے بہتر انتخاب کوئی اور ہو نہیں سکتا تھا چنانچہ ان دو حضرات نے دو تین برس مصر میں مقیم رہکر اس کارِ عظیم واہم کو بکمال حسن و خوبی انجام دیا اور یہ دونوں کتابیں اعلیٰ ٹائپ و طباعت سے آراستہ ہو کر نور دیدہ اربابِ نظر ہوگئیں، مولانا محمد میاں سملکی مرحوم جو دورۂ حدیث میں میرے ہمدرس و ہم جماعت اور نہایت بے تکلف دوست تھے بڑے مخیر تھے انھوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ لیکن اون کا یہ ایک کارنامہ اس درجہ عظیم ہے کہ میں جب کبھی اس کا تصور کرتا ہوں اون کے لئے بیساختہ دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے ارباب دیوبند عام طور پر اس کا ذکر نہیں کرتے۔ اس کارنامہ سے حسب ذیل چند نہایت اہم فائدے ہوئے۔

(۱) حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے درس بخاری کی تقاریر جو آپ کے علوم و فنون کا گنجینۂ گرانمایہ ہوتی تھیں۔ نہایت اہتمام و انتظام سے عربی زبان میں فیض الباری علیٰ صحیح البخاری کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوگئیں اور اون کے ذریعہ عالم اسلام کو حضرت شاہ صاحب کے مرتبہ و مقام سے گہری اور ٹھوس واقفیت ہوئی۔

(۲) دار العلوم دیوبند کا دنیائے عرب میں تعارف ہوا، کیونکہ مولانا سید محمد یوسف بنوری نے اس سلسلہ میں متعدد مضامین لکھے اور قاہرہ کے الاسلام اور دوسرے مجلات میں انھیں شائع کرایا۔

(۳) تیسرا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس سہ سالہ قیام مصر کو مولانا بنوری کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بڑا دخل ہے۔ مولانا نہایت ذہین اور تحقیق و مطالعہ کے بڑے رسیا تھے انھوں نے اس زمانہ میں قاہرہ کے عظیم کتب خانوں سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ علامہ زاہد کوثری اور دوسرے اجلۂ علماء کی صحبتوں سے متمتع ہوئے۔ اور عربی زبان میں تحریر و تقریر اور اوس میں شعر گوئی کا

لکہ پیدا کیا، عرب ممالک کے نظامِ تعلیم کا قریب سے مطالعہ کیا۔ پھر وہ صرف قاہرہ میں محدود نہیں رہے بلکہ یونان، ترکی اور حجاز مقدس کا بھی سفر کیا اور ان ملکوں کے اعاظم علماء و محققین سے ملاقاتیں کرکے ان سے استفادہ کیا اس طرح ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہوا علم میں پختگی، نظر میں بلندی اور قوت اظہار و بیان میں روانی اور شستگی و شائستگی پیدا ہوئی جو محض ڈابھیل یا دیوبند میں محصور رہنے کی صورت میں ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ اس تبحر مہارت فن، بالغ نظری اور عالم اسلام کے عظیم ترین علمائے محققین کو جانچنے اور پرکھنے کے بعد اگر اپنا سرِ عقیدت و ارادت جھکایا تو صرف آستانۂ انوری پر، یہ امر بذات خود حضرت شاہ صاحب کی فضیلت و برتری کی دلیل ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں جب قاہرہ میں میری اُن کی ملاقات ہوئی تو میں نے ایک دن ان سے پوچھا: آپ نے حضرت شاہ صاحب میں اور علامہ زاہد کوثری، اور قاہرہ کے دوسرے علمائے محققین مثلاً احمد شاکر، محمد شاکر وغیرہما میں کیا فرق پایا؟ بولے ہندوستان میں وہ مطبوعات و مخطوطات کہاں ہیں جو یہاں ہیں، اس بنا پر مطالعہ جتنا وسیع ان حضرات کا ہوسکتا ہے، حضرت شاہ صاحب کا نہیں ہوسکتا تھا، لیکن جو جامعیت، رسوخ فی العلم۔ دقت و اصابتِ نظر اور پھر اعتدال توسط اور کھرے کھوٹے کی پرکھ ہمارے استاذ کے ہاں ہے وہ کہیں بھی نہیں، وکفیٰ لنا فخراً میں نے کہا: آپ نے بالکل درست کہا۔ یہی رائے بعینہٖ میری ہے۔ بہت خوش ہوئے اور دیر تک حضرت الاستاذ کا تذکرہ کرتے رہے پھر آواز ذرا بلند کرکے کہا: اگر زیادہ کتابیں دیکھنا ہی معیارِ فضیلت ہے تو آج کے ہر محقق کو ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن رشد پر فضیلت و ترجیح ہونی چاہیے۔

مصر سے واپسی کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حدیث کا درس دیتے رہے ملک تقسیم ہوا تو جنوری ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ میں شیخ التفسیر والحدیث ہوکر چلے گئے۔ تین برس کے بعد یہاں سے مستعفی ہوکر کراچی میں آئے۔ اور حرمین شریفین کا

سفر کیا، واپس کراچی آئے تو مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے نام سے نیو ٹاؤن کراچی میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ جواب ماشاء اللہ "اصلها ثابت وفرعها فی السماء" کے مصداق اپنی شان کا ایک نیا مدرسہ ہے۔ سفرنامۂ پاکستان میں اس کا تعارف کرا چکا ہوں۔ اب یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک ہمہ جہتی شخصیت کے مالک تھے، علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں مہارت رکھتے تھے، عربی اور فارسی، اردو، اور پشتو چاروں زبانوں کے ادیب و خطیب تھے اور عربی میں شعر بھی کہتے تھے، ان کے نعتیہ قصائد قاہرہ کے مجلۃ الاسلام میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی سب سے پہلی کتاب بغیۃ الاریب فی احکام القبلۃ والمحاریب ہے جو فنی اعتبار سے نہایت اہم ہے، اچھے اچھے علماء اس فن سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں مصر سے پہلی بار شائع ہوئی، دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) نفحۃ العنبر فی حیاۃ الشیخ انور، ۱۹۳۵ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ حضرت شاہ صاحب کی سوانح حیات عربی زبان میں ہے۔ اس کا دوسرا اڈیشن جو پہلے سے کہیں زیادہ ضخیم ہے کراچی سے شائع ہوا۔

(۲) یتیمۃ البیان فی مشکلات القرآن (۳) تسخیر کائنات اور اسلام (اردو) (۴) ختم نبوت (اردو) موصوف کا سب سے بڑا تصنیفی کارنامہ سنن ترمذی کی عربی شرح معارف السنن ہے۔ جس کی چھ جلدیں شائع ہوئی ہیں ان سب کے صفحات کی مجموعی تعداد تین ہزار کے قریب ہوگی، مولانا کا ارادہ اس کو دس جلدوں میں مکمل کرنے کا تھا۔ لیکن جیسا کہ انھوں نے خود مجھ سے آخری ملاقات میں کہا تھا چھٹی جلد کی تکمیل کے بعد ان کی ہمت اور طاقت نے جواب دیدیا۔ اور انھوں نے قلم رکھدیا، تاہم یہ جلدیں مولانا مرحوم کے علوم و فنون میں نبوغ و کمال کی سب سے روشن دلیل ہے۔ برصغیر ہند و پاک سے

زیادہ عرب ملکوں میں اس کی شہرت ہے۔ ان مستقل تصنیفات کے علاوہ انھوں نے بعض کتابوں پر نہایت فاضلانہ مقدمات بھی لکھے، مثلاً مقدمہ فیض الباری، مقدمہ مشکلات القرآن مقدمہ عبقات، مقدمہ عقیدۃ الاسلام، مقدمہ لامع الدراری، مقدمہ نصب الرایہ لتخریج الہدایہ مقدمہ مقالات الزاہد الکوثری۔ "البینات" کے نام سے اردو میں ایک دقیع علمی اور دینی ماہنامہ بھی مدرسہ عربیہ اسلامیہ سے شائع کرتے تھے اوس میں بھی اون کے بہت سے فقہی، اصلاحی اور علمی مقالات شائع ہوتے، انھوں نے پاکستان میں متعدد دینی تحریکوں کی قیادت بھی کی اور انھیں کامیاب کرکے ہی دم لیا۔ نہایت مخلص، بے لوث و غرض انسان تھے۔ اس لئے جو بات بھی کہتے تھے حکومت اور عوام دونوں اوس کا وزن محسوس کرتے تھے۔ حجاز مقدس سے اون کو عشق تھا۔ سالہا سال سے معمول یہ تھا کہ رمضان وہیں گذارتے تھے اور دوبارہ حج کرنے جاتے تھے، سعودی عرب میں خصوصاً اور دوسرے عرب ملکوں میں عموماً بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے اور ان ممالک کی اکثر دینی اور علمی کانفرنسوں میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے۔

میرے ساتھ اون کو ایک خاص قسم کا رابطہ، قلبی و روحانی تھا اور مجھے اون کے ساتھ بڑی عقیدت اور محبت تھی بیرونی ممالک میں یا پاکستان میں جب کبھی ملتے فرط محبت سے ہم آغوش ہو جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے مزاج میں بڑی حدت اور شدت تھی اور کہنے سننے میں بڑے بیباک اور جری تھے، لیکن میرے ساتھ اون کی مروت اور لحاظ کا معاملہ اس حد تک تھا کہ مجھے معلوم ہے، انہیں میرے بعض افکار و آرا سے اختلاف تھا اور اسی طرح میں بعض مسائل میں اون سے متفق نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود کبھی ایک مرتبہ بھی انھوں نے اشارۃً و کنایۃً ان چیزوں کا مجھ سے تذکرہ نہیں کیا یہاں تک کہ ۱۹۷۶ء میں جب میں جنوبی افریقہ کا دورہ کر رہا تھا۔ مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری بھی وہاں پہونچ گئے۔ میں نے وہاں اپنی بعض انگریزی اور اردو تقریروں میں جنوبی افریقہ